ڈاکٹر راحیلہ خورشید*

اردو ناول کے معروف ناسٹلجیائی کردار

Abstract: *Nostaljia is a psychological term. In the past it was considered as an illness, but in the present era past it is considered as a metaphor for pleasant moments along with the unpleasant memories. Nostalgia may or may not also be known as home sickness. Urdu novel is such a great asset of Urdu literature where psychological consciousness can be seen. Nostaljia is mentioned in one way or another in every genre of literature (prose or poetry), because a man cannot live if he cuts himself off from past. Among the representative novels that deal with Nostalgia are "Khadija Mastoor", "Angan", "Intezar Hussain", "Basti", "Qura tul Ain Haider", "Aag ka Darya", "Bano Qudsia", "Raja Gidh", "Abdullah Hussain" and "Odas Naslen.".*

ناسٹلجیا نفسیاتی اصطلاح ہے جس کو گزرے لمحوں کی شدت سے جوڑا جاتا ہے۔ماضی میں اسے ایک بیماری سمجھا جاتا تھا۔موجودہ دور میں ماضی کو ناخوشگوار یادوں کے ساتھ ساتھ خوشگوار لمحوں کا استعارہ سمجھا جاتا ہے۔ قاضی جاوید ناسٹلجیا کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں۔

"بہت سے دوسرے خیالات اور احساسات کی طرح ناسٹلجیا کا احساس بھی ہماری سماجی زندگی کو متاثر کرتا ہے وہ ہمیں ماضی کے لمحوں اور مقامات سے ایسے اجزا تلاش کرنے پر آمادہ کرتا ہے جو ہماری موجودہ صورت حال کی ناگواری کا مداوا کر سکے"(۱)

پریکٹیکل ڈکشنری میں نسٹالجیا کے معنی یوں درج ہیں:

"Nostalgia describes a longing for the past after in Idealized form. Nostalgia may or may not also be known as homesickness"(۲)

زمانہ حال، ماضی اور مستقبل سے تعبیر ہے۔ کوئی بھی معاشرہ تب تک نامکمل رہتا ہے جب تک ماضی اور حال باہم مربوط نہیں ہو جاتے۔ اسی طرح انسانی شخصیت کی تکمیل کے لئے بھی ماضی کو تصور میں لا کر ذات میں سمویا جاتا ہے۔ گویا انسان کا تشخص اس کے ماضی میں پنہاں ہے۔ انفرادی اور اجتماعی تشخص کی اساس یادداشت پر ہے۔ یادداشت کے نہ ہونے سے ماضی بھی منہدم ہو جاتا ہے اور پھر انسانی زندگی کا ورثہ اپنی اہمیت کھو دیتا ہے۔ ماضی کوئی گمشدہ چیز نہیں ہے بلکہ حال اور مستقبل سے وابستہ امیدوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ بقول انتظار حسین:

* اسسٹنٹ پروفیسر (شعبہ اردو) آزاد جموں وکشمیر یونی ورسٹی

"حافظہ نہ ہو تو ماضی کا عرفان کیا اور ماضی کا عرفان نہ ہو تو حال و مستقبل کی حد بندی کیا۔ یہ عمل ظاہر ہے محض ایک غیر محدود، بے نام نشان سے حال میں زیست کرنے سے جاری ہو سکتا ہے نہ حاصل۔"(۳)

ادب اور نفسیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دنیا میں جس قدر تعلیم کے نظام موجود ہیں یا جتنے موضوعات پر درس دیا جاتا ہے۔ ان میں سے علم نفسیات وہ واحد مضمون ہے جس کا انسانی زندگی اور انسانی مسائل کے ساتھ گہرا تعلق ہے کیوں کہ نفسیات انسانی کردار اور ذہن کے مطالعے کا نام ہے۔ دوسری طرف چونکہ ادب معاشرے کا عکاس اور ترجمان ہے۔ اس لئے اس کا رشتہ بھی نفسیات سے لازم و ملزوم ہے۔ ادب بنیادی طور پر نفسیاتی رویوں، جذباتی اتار چڑھاؤ اور رجحانات کے نمود ہی کا نام ہے۔ ادب کی تخلیق میں بلکہ ادبی سطح پر تنقید کرتے ہوئے بھی ادب کی کار فرمائی سے انکار ممکن نہیں۔ ادب چاہے نثری صورت میں ہو یا شعری پیکر میں، ماضی پرستی کے ساتھ گہرے روابط کا غماز ہے۔ افسانوی ادب (داستان، ناول، ڈرامہ اور افسانہ) نسٹالجیائی جذبات و احساسات کی تصویر کشی کا مظہر رہا ہے۔ اردو ناول اردو ادب کا ایسا عظیم سرمایہ ہے جس میں نفسیاتی شعور کی کار فرمائی دیکھی جا سکتی ہے۔ اول تو یہ کہ ناول نگار کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کا اظہار اس کے ناولوں میں جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے۔ کیوں کہ ایک انسان ہونے کے ناطے اس کی اپنی نفسیات، محبت، نفرت، ضد، انا، دکھ سکھ، اغراض و مقاصد، بھوک یا جنس، انتقام، غصہ، حسد، احساس کمتری، احساس برتری اور نسٹالجیا جیسے عوامل سے مربوط ہے۔ ناسٹلجیا کا ذکر کسی نہ کسی طور پر ادب کی ہر صنف میں (نثر ہو یا شاعری) پایا جاتا ہے۔ کیونکہ انسان اپنے ماضی سے کٹ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ ناسٹلجیائی رجحان کے لکھے جانے نمائندہ ناولوں میں خدیجہ مستور کا ناول "آنگن" انتظار حسین کا "بستی" قرۃ العین حیدر کا "آگ کا دریا" بانو قدسیہ کا "راجہ گدھ" عبداللہ حسین کا "اداس نسلیں" قابل ذکر ہیں۔

خدیجہ مستور کے ناول " آنگن "میں ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے مختلف نظریات اور نفسیاتی مسائل کا شکار ہیں۔ بڑے چچا کٹر کانگریسی ہیں، جمیل بھیا مسلم لیگ پر زندگی نثار کرنے کے لئے تیار ہیں نجمہ پھوپھی انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد احساس برتری کا شکار ہیں۔ وہ ایک ایسے طبقے کی نمائندگی کرتی ہیں جو اردو سے نفرت کرنے والا طبقہ ہے۔ کریمن بوا ماضی پرستی کا شکار ہیں۔ عالیہ ناول کا سب سے زیادہ جاندار کردار ہے جو ماضی کے جھروکوں میں جھانکنا اور پناہ لینا پسند کرتی ہے۔ ناول کے پہلے حصے میں ماضی کی یادیں ہیں اور دوسرے حصے میں حال صدا بن کر گونجتا ہے۔ آغاز ہی میں ناسٹلجیا کے عناصر دکھائی دیتے ہیں۔ عالیہ اپنے والد کے تبادلے کے بعد نئے گھر میں ماضی کی یادوں میں کھوئی دکھائی دیتی ہے:

"اسے نیند نہ آ رہی تھی، رات کو نیند نہ آنا کتنا تکلیف دہ احساس ہوتا ہے یہ احساس اس وقت تو اور بھی شدید ہو جاتا ہے۔ جب بالکل نئی جگہ ہو شاید نئی جگہوں کی پہلی رات اسی طرح بے خوابی سے گزرتی ہو گی۔ اس نے ایک بار پھر سو

جانے کی کوشش کی۔۔۔۔۔۔ دیر تک بے سدھ پڑے رہنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس کی ساری جدوجہد بے کار گئی ہے۔ نیند کا تو کوسوں پتہ نہیں تھا۔ ماضی کی یادیں بگولے کی طرح دماغ میں لگ رہی تھیں۔"(۴)

مستقبل سے خوفزدگی اور حال سے مایوس ہو کر ماضی میں پناہ لینا ناسٹلجیا ہے۔ ناسٹلجیا کی تین صورتیں ہیں۔ شخصی ناسٹلجیا میں کسی فرد کی یادوں میں پناہ ڈھونڈی جاتی ہے۔ زمانی ناسٹلجیا میں بچپن، جوانی یا کسی خاص دور کو یاد کیا جاتا ہے۔ جب کہ زمینی ناسٹلجیا میں کسی خاص علاقے اور زمین کی یاد انسانی ذہن پر حاوی رہتی ہے۔ عالیہ کا کردار ناسٹلجیائی حوالے سے تینوں صورتوں کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ ایک طرف باپ اور بہن کی جدائی کے کرب میں مبتلا ہے اور دوسری طرف اپنے اس گھر کو چھوڑ کر بڑے چچا کے ہاں قیام کرتی ہے۔ جہاں اس کا بچپن اور جوانی کا حسین دور گزرا تھا۔ ایک اور جگہ عالیہ ماضی کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہے:

"اب نیند نہیں آتی۔ جب تک دماغ کی دنیا ویران نہ کی جائے نیند کا کہاں سے گزر ہو ماضی آسیب بن کر اسے مسلسل خوف زدہ کر رہا تھا۔۔۔۔ وہ کس طرح گزرے وقت سے اپنا دامن چھڑائے۔"(۵)

عالیہ شروع سے ہی حساس طبیعت کی مالک ہے۔ والد کے جیل جانے کے بعد وہ مجبوراً بڑے چچا کے گھر رہتی ہے۔ مگر وہ پرانے گھر میں گزاری ہوئی یادوں سے دامن نہیں بچا پاتی اور مسلسل ماضی پرستی کا شکار رہتی ہے۔ پرانی روایات سے جڑی ہوئی کریمن بوا عالیہ کی دادی کے جہیز میں آئی تھیں۔ کریمن بوا کا مقام گھر میں اہم حیثیت کا حامل ہے۔ وہ ہر رشتے کی خیر خواہ ہیں مگر ان کے دل و دماغ پر پرانی یادوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔ وہ ماضی اور حال کے واقعات میں فرق کو بہت بہتر طریقے سے سمجھتی ہیں اور حال میں پیش آنے والے واقعات کو ماضی کی لڑیوں میں پرو دیتی ہیں۔ وہ موجودہ حالات و واقعات کا تقابل ماضی کی خوشحالی کے ساتھ کر کے دکھی رہتی ہیں۔ نفسیاتی اعتبار سے کریمن بوا زمانی ناسٹلجیا کا شکار ہے۔ کریمن بوا ہر لمحہ گذرتے ہوئے زمانے کو یاد کرتی ہیں۔ ان کی گفتگو پر ہمیشہ ماضی کی پرچھائیاں پڑی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ اپنی ناسٹلجیائی کیفیت کا اظہار اس طرح کرتی ہیں:

"ایک وہ بھی زمانہ تھا جب سارے صبح اٹھ کر بڑوں کو سلام کرتے تھے۔ جو کچھ تھا سب ماں باپ کے ہاتھ میں تھا۔"(۶)

کریمن بوا اچھے دنوں کو یاد کر کے افسوس کرتی ہیں۔ اس کے دماغ میں ماضی کی یادیں کروٹیں بدلتی رہتی ہیں۔ وہ ماضی کے واقعات کو یاد بھی کرتی ہے اور انہی دنوں کے واپس آنے کی خواہش کا اظہار بھی۔ کیوں کہ اس نے اس زوال پذیر پریشان حال خاندان کا عروج بھی دیکھا ہے۔ یہ کردار وفاداری کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ کیوں کہ اچھے وقت میں ساتھ نبھانے والی کریمن بوا برے وقت میں بھی بڑی مالکن کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ اسے گھر اور گھر کے مکینوں سے اس حد تک ہمدردی ہوتی ہے کہ وہ موجودہ حالات کو دیکھ کر کڑھتی رہتی ہے۔

کریمن بوا ماضی پرستی کے سہارے زندگی گزار رہی ہے۔ وہ اکثر ماضی میں کھوئی رہتی ہے۔ ایک رات جب شکیل کافی دیر تک گھر نہیں آیا تو اس وقت کریمن بوا ماضی کو اس طرح یاد کرتی ہیں:

"زمانے زمانے کی بات ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ بڑے سرکار کے سب بچے سات بجے کے بعد گھر سے قدم نہ نکالتے۔ گزرا زمانہ کریمن بوا کا سایہ بنا ہوا تھا۔(۷)

ایک اور جگہ کریمن بوا اس طرح ماضی کی یادوں کو تازہ کرتی ہے:

"عالیہ بٹیا! اسی گھر میں جاڑوں کے دنوں میں اپنے ہاتھوں سے منوں لکڑی پھونک دیتے تھے۔ ارے یہ دالان جو آج ٹھنڈا پڑا ہے پہلے آگ کی طرح تپتا تھا اب کوئی آگ بھی ہے۔ چولہے میں بیٹا؟۔۔۔۔۔۔ کچھ دنوں سے کریمن بوا بڑی بجھی بجھی اور ہراساں نظر آنے لگی تھیں۔ بیتا زمانہ انہیں بہت شدت سے ستانے لگا تھا۔"(۸)

اور جب پاکستان بن جاتا ہے اور ہجرت کا آغاز ہوتا ہے تب زمانی ناسٹلجیا کا شکار کریمن بوا کی کیفیت اس طرح ہوتی ہے:

"زمانے زمانے کی بات ہے۔ وہ بھی ایک دور تھا جب ہندو مسلم کا اتفاق مثالی تھا۔۔۔۔۔ مسلمان ہندو کی عزت بچانے کے لیے زندگی قربان کر دیتا تھا۔"(۹)

مندرجہ بالا اقتباس آزادی کے بعد آنے والے اتار چڑھاؤ کی بھرپور عکاسی کرتا ہے کہ کس طرح مسلمان اور ہندو ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن گئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اردو ادب نئے موضوعات سے آشنا ہوا۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت پیش آنے والی تباہی انسانیت سوز واقعات، عورتوں کی عصمت دری اور جبر میں کی گئی ہجرت نے نہ صرف عام فرد کو متاثر کیا بلکہ تاریخ کے اس فیصلے سے ادیب اور شاعر بھی متاثر ہوئے۔ مانوس زمین سے غیر مانوس زمین کی طرف ہجرت کرنے والوں کو یہ سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے اور جب بدلتے ہوئے حالات کا اندازہ ہوا تو تب تک جاگیر دار طبقہ اپنی اجارہ داری قائم کر چکا تھا۔ وطن چھوڑ کر آنے والوں کے لئے موجودہ حالات سے فرار کا ایک ہی راستہ بچا تھا کہ وہ گزرے ہوئے کل کی یادوں میں پناہ حاصل کر لیں۔

قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" ماضی پرستی کے حوالے سے بہترین مثال ہے۔ انہوں نے ناسٹلجیا کو نئے رجحان کے ساتھ پیش کیا وہ صرف کھوئی ہوئی تہذیب کی تلاش میں ماضی کے جھروکوں میں نہیں جھانکتیں بلکہ اس بات کی گہرائی میں بھی جاتی ہیں کہ قومیں کن وجوہات اور اتار چڑھاؤ کی وجہ سے ناسٹلجیا کا شکار ہوتی ہیں۔ روبینہ الماس کے مطابق:

"ماضی کی باز آفرینی کا شدت سے استعمال قرۃ العین اور انتظار حسین کے یہاں ملتا ہے بلکہ افسانوں میں ماضی کی باز آفرینی کی روایت کے موجد قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین ہی ہیں۔"(۱۰)

قرۃ العین حیدر ناول "آگ کا دریا" کو ٹی ایس۔ ایلیٹ کی نظم Four Quarters سے شروع کرتی ہیں۔اس حوالے سے اسلوب احمد انصاری تحریر کرتے ہیں:

"قرۃ العین حیدر نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ ایلیٹ کی مشہور نظم Four Quarters سے ایک اقتباس اپنے ناول کے لئے بطور Epigraph استعمال کیا ہے کہ اس نظم کے چاروں حصے وقت اور ابدیت کے رشتے پر اس کے عمل تفکر کا ایک بھرپور شاعرانہ اظہار ہیں اور یہ ناول بھی بنیادی طور پر وقت ہی کی کارفرمائی سے متعلق ہے۔"(۱۳)

ٹی۔ ایس ایلیٹ کے مطابق موجودہ وقت اور گزرے ہوئے وقت کا آپس میں مضبوط رشتہ ہے۔ موجودہ وقت ماضی میں بھی شریک ہے اور مستقبل سے بھی تعلق رکھتا ہے یعنی موجودہ وقت گزرے اور آنے والے وقت کے ساتھ مربوط ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ناول آگ کا دریا میں ماضی کے متعلق مضبوط اور زندہ احساس موجود ہے۔ وہ اس احساس کے ذریعے ماضی کے اوراق کا جائزہ لیتی ہیں اور ماضی کے علاوہ ہجرت کے کرب کو اپنی تحریروں کا حصہ بناتی ہیں۔ انہوں نے آگ کا دریا میں اجتماعی سطح پر انسانی نفسیات کا جائزہ پیش کیا ہے اور ہر طرح کی جبلّت رکھنے والا انسان ان کا بنیادی موضوع ہے۔ ڈاکٹر خالد اشرف تحریر کرتے ہیں:

"ان کے سامنے انسان کے ماضی کی طویل ترین تاریخ ہے۔۔۔۔۔۔ وقت ایک اندھی طاقت ہے جس کی زد میں آنے والے جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے صرف آج کے انسان کو نہیں بلکہ Total Man کو پیش کیا ہے۔۔۔۔۔ انہوں نے مذہبی، تاریخی، فلسفی، عیش پرست، جنگجو ہر طرح کے قالب میں انسان کو دیکھا ہے اور ایسا انسان پیش کیا ہے جو صدیاں گزار کر آیا ہے جو کہ تاریخ ہے اور صدیوں پر محیط وقت کا احاطہ کرتا ہے۔"(۱۲)

دنیا اختلاف انسانی کا نام ہے۔ اور مختلف جبلّتوں کا اظہار انسان کے ذریعے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے Total Man کی نفسیات انسانی جبلّت کے مطابق پیش کی ہے۔ انسان جو ماضی پرستی کے عارضے میں مبتلا ہے۔ وقت کے تیز دریا کے آگے مجبور ہے۔ موجودہ حالات سے مایوس اور مستقبل کے حوالے سے خوف کا شکار انسان ایک طرف امن کا متلاشی ہے۔ تو دوسری طرف اپنے جیسے انسانوں کا خون بہانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ مصنفہ نے مجموعی طور پر انسان کی دورخی شخصیت کا احاطہ کیا ہے۔

"آگ کا دریا" کا آخری حصہ ناسٹلجیا سے پُر ہے۔ اس میں برصغیر کی تقسیم کے واقعے اور ہجرت کے بعد پیش آنے والے مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ اس حصے کے کردار ماضی کے سہارے زندگی گزارنے والے انسان ہیں۔ مگر اپنی انقلابی اور جذباتی سوچ کی وجہ سے تنہائی کی اذیت سے بھی دوچار ہیں۔ ڈاکٹر محمد افضال بٹ تحریر کرتے ہیں:

"قراۃ العین حیدر کے ناولوں میں ماضی چھپا ہوتا ہے۔ جس میں مشترکہ ہندو مسلم تہذیب کا زوال۔۔۔۔۔ اور قدیم وضع داریوں کا ٹوٹنا وغیرہ شامل ہے۔"(۱۳)

''آگ کا دریا'' میں مصنفہ نے دو طرح کے المیے کو بیان کیا ہے۔ ایک طرف مسلمانوں کے زوال کے نتیجے میں بر صغیر کی تقسیم کا عمل میں آنا اور دوسری طرف ہجرت کے بعد عام فرد کے لئے نئے مسائل کا سامنا۔ قرۃ العین حیدر کے مطابق بر صغیر کی تقسیم انسانی مسائل میں اضافے کا باعث بنی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے کردار ماضی کی یادوں پر ماتم کرتے دکھائی دیتے ہیں:

''سورماؤں کا تذکرہ رگ وید اور قدیم ترین برہمن ادب میں موجود تھا۔ جس میں ہر چیز اصل سے بڑی دکھلائی دیتی تھی۔ بادلوں کی گرج، ہاتھیوں کی چنگھاڑ، عظیم معرکے، دلاور سورما۔۔۔۔ آسمانی سنگیت، پری وش لڑکیاں۔۔۔ سب طلسماتی ہستیاں ڈیڑھ ہزار برس زندہ رہی ہوں گی۔ یہ سب سوچ کر گوتم کو بڑا عجیب لگتا تھا کہ ایک وقت تھا کہ نریدا اور تاپتی کے درمیان راجہ نل کی حکمرانی تھی۔ رمینتی برار کی راج کماری تھی۔ سستا مہارانی کے بابا کا ملک اس گنگا کے اتر میں گنڈک ندی کے کنارے کنارے آباد تھا۔ پل کی پل میں وہ سارا زمانہ داستان میں تبدیل ہو گیا اور یہ وقت جس میں وہ زندہ تھا۔ وہ خود گوتم نیلمبر، ہری شنکر بھکشو جو کھڑکی کے پاس بیٹھا مطالعے میں مصروف تھا اور ایودھیا کی چمپک اور باہر آشرم کے کنج میں ٹہلتے ہوئے طالب علم۔ یہ سب کے سب آن کی آن میں ماضی کے دھندلے، ناقابل یقین غیر حقیقی کرداروں کی حیثیت اختیار کر لیں گے۔''(۱۴)

ناول میں جابجا نسٹلجیا کا اظہار ملتا ہے ناول کے آغاز میں جب گوتم بارش کے قطروں کی آواز سنتا ہے تو اس آواز کو رگ وید میں بیان کی گئی بارش کے ساتھ جوڑ کر گہری سوچوں میں گم ہو جاتا ہے:

''کیا میں ابھی تک اپنے حافظے پر قابو نہیں پا سکتا۔ مجھے غیر ضروری باتیں کیوں یاد رہتی ہیں۔ اس نے اداسی سے سوچا اور کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور بارش کی بوندوں کو دیکھنے لگا۔''(۱۵)

ماضی پرستی کا رجحان اپنے اندر زبردست قوت اور زندہ احساس کا حامل ہے۔ ناول نگار کی نظر میں ماضی راہ فرار کے بعد پناہ لینے کی محفوظ جگہ ہے۔ کیوں کہ ماضی پرستی میں انسان اس خوف سے آزاد ہو جاتا ہے کہ ابھی زندگی مزید حادثات سے دوچار ہو سکتی ہے۔ اس طرح کا خوف ماضی پرستی کے رجحان میں نہیں پایا جاتا۔

''یہ میرا کمرہ ہے۔ ہمارے آئی ٹی والے نشاط محل ہوسٹل کے کسی کمرے کا ایسا ہے نہ، نرملا نے طلعت سے کہا تھا۔ یہ لوگ ہر شے ماضی سے منسلک کرتی جاتی تھیں۔ (سوئٹزر لینڈ نینی تال تھا ایک ڈسٹرکٹ وہرہ دون کی طرح تھی لندن میں بمبئی کی جھلک تھی) ماضی محفوظ تھا، کیوں کہ اس میں کسی حادثے کا امکان نہیں تھا۔''(۱۶)

"آگ کا دریا" تیزی و تندی سے بہتا ہوا دریا ہے جو ماضی کی جھلکیاں بھی دکھاتا ہے اور گزرے ہوئے کل پر غرور بھی، حال کے واقعات پر افسوس بھی اور آنے والے کل کے لحاظ سے خدشات بھی۔ اس دریا کی لہروں کے ساتھ موجزن رہتے ہیں۔ ناول میں ماضی، حال اور مستقبل ایک ہی لڑی میں پروئے دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً کمال اپنے بچپن کو اس طرح سے یاد کرتا ہے:

> "کمال کو اپنے بچپن کا زمانہ بڑے واضح طور پر یاد تھا۔ جب وہ گھر میں بڑوں کی سیاست کے تذکرے سنتا۔۔۔۔ جب ذرا اور بڑا ہوا تو اپنے ہندوستانی ہونے پر اسے ناز سا محسوس ہونے لگا۔ اس ناز میں زیادہ تر اپنے ماضی پر فخر کا عنصر شامل تھا۔ ہم یوں تھے ہم وہ تھے۔۔۔۔۔۔ یہ ہندوستان کیا تھا۔ اس کا شعوری طور پر اس نے کبھی تجزیہ نہیں کیا۔ بچپن سے وہ اس ہندوستان کا عادی تھا۔ جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ جہاں اس کے پرکھ پچھلے سات آٹھ سو سال سے پیدا ہوتے آئے تھے۔ اس ہندوستان میں سرسوں کے کھیت تھے۔۔۔۔۔۔ ہندو پرانول اور دیو مالا کے قصے۔ یہ سب کمال کی ذہنی بیک گراؤنڈ تھی۔ ایک غرور اپنے ماضی پر، ایک تاسف اپنے حال پر، ایک امید اپنے مستقبل کے متعلق۔۔۔۔۔ ان تین عناصر سے اس کے ذہن کی تشکیل ہوئی تھی۔"(۱۷)

ٹی ایس ایلیٹ کے مطابق حال ماضی کے ساتھ بھی شریک ہے اور مستقبل میں بھی موجود ہے ہم جن لمحات میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کا مضبوط تعلق ماضی اور مستقبل سے مربوط ہے۔

ناول کے کردار کھوئی ہوئی اس تہذیب، آبادی، روایات اور رشتوں کو تلاش کر رہے ہیں۔ جس کو وقت کے دریا نے تباہ و برباد کر ڈالا ہے۔ گوتم، چمپک اور کمال سب ماضی کو شعور میں زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے گذرے وقت کا تعلق ماضی کے ساتھ مضبوطی سے جوڑا ہوا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ہاں ماضی سے رسمی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ ماضی ایک رجحان، ایک نظریہ، اور تہذیب بن کر حال کے راستے پر گامزن رہتا ہے۔

"آگ کا دریا" میں اڑھائی ہزار سالہ تہذیب کا بڑی مہارت سے احاطہ کیا گیا ہے۔ گوتم بدھ سے لے کر آج تک کے معاشرے کی حقیقی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ناول میں موجود کردار حال میں زندگی گزارتے ہوئے ماضی سے رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔ ناسٹلجیائی رجحان کے تحت لکھے گئے ناولوں میں "آگ کا دریا" نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

ناول "اداس نسلیں "نسٹالجیا کے حوالے سے نمائندہ ناولوں میں شامل ہے۔ ناول میں ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی سے لے کر ہندوستان کی تقسیم تک کے تمام مسائل شامل ہیں۔ ناول تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ انگریزوں کی حکومت کے متعلق ہے دوسرے حصے میں مسلمان آزادی کی کوشش میں جان کی قربانی دے رہے ہیں۔ جب کہ تیسرے دور میں برصغیر کی تقسیم کا مرحلہ طے ہو چکا ہے اور اب ہجرت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل سامنے آ رہے ہیں۔ اداس نسلیں موضوع کے اعتبار سے منفرد ناول ہے۔ کیوں کہ اس

میں صرف ایک فرد کو موضوع نہیں بنایا گیا بلکہ تین نسلوں کی زندگی میں پائی جانے والی پریشانیوں کا ذکر ہے۔ناول کا مرکزی کردار نعیم اور عذرا ہیں یہ دونوں کردار نفسیاتی عارضے ناسٹلجیا میں مبتلا ہیں۔ نعیم ہر اس کام کو دل جمعی سے کرتا ہے جس سے اس کی ماضی کی یادیں وابستہ ہوتی ہیں۔ناول میں جگہ جگہ ناسٹلجیائی کیفیت نظر آتی ہے۔ نعیم جب شدید بیماری کا مقابلہ کرتا ہے تو اس دوران ماضی کے اوراق کو پلٹتا ہے اور بے چین و مضطرب دکھائی دیتا ہے:

"ایک غیر ملکی کا چہرہ تھا جس کی سادہ بے فن آنکھیں تھیں۔ جو ایک چھوٹے جرمن گاؤں میں لکڑی کا کام کرتا تھا اور جس نے اپنی معصومیت میں اس پر اپنی دوستی اور رفاقت کا احسانِ عظیم کیا تھا اور اسے احساس ہوا تھا کہ اگر وہ اجنبی سب کچھ جانتا ہوتا تو بھی یہی کرتا"(۱۸)

اسی طرح ایک اور جگہ جب نعیم اور علی بٹوارہ کرتے ہیں اور پنجاب کے ایک گاؤں میں کھیتی باڑی کا ارادہ کرتے ہیں۔ تو علی اور نعیم گزرے وقت کا ذکر کر کے ماضی کی یادوں کو تازہ کرتے ہیں:

"تمہیں اپنے باپ کی باتیں یاد ہیں مجھے اس کے دیے ہوئے سارے سبق آج تک یاد ہیں۔ گیلی زمین میں مینڈک بھی مر جاتے ہیں بیج تو بڑی نازک شے ہیں وہ کہا کرتا تھا۔۔۔۔۔۔کسان اگر ترقی کرنا چاہتا ہے تو بارہ مہینے گیہوں نہیں کھا سکتا"(۱۹)

آگے چل کر دونوں اپنے گاؤں میں بسنے والے گڑ کے طریقے کو یاد کرتے ہیں:

"گڑ بنانے کا طریقہ تمہیں یاد ہے؟

بھنڈی کے ڈنٹھل۔۔۔۔۔۔۔۔

ہاں ہاں بھنڈی کے ڈنٹھل میل کو کاٹ کر لٹھے کی طرح سفید گڑ بناتے ہیں۔ مگر گنے کی حفاظت کرنا بڑا جان جوکھم کا کام ہے۔ماگھ کی راتوں میں کھیت کا ایک چکر لگاؤ تو ہاتھوں میں خون جم جاتا ہے اور جنگلی سور جو کھیت کے کھیت کا ستیا ناس کر دیتا ہے۔ میں نے ایک بار زخمی سور مارا تھا آمنے سامنے ہو کر بڑا شریف جانور تھا کوئی، پر بھئی کیا نادانی کی عمر تھی"(۲۰)

ناول "اداس نسلیں" کا اہم پہلو یادوں کی وسیع دنیا ہے جو ناول میں موجود کرداروں کے لیے زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔ جسے نفسیاتی سطح پر ناسٹلجیا کا نام دیا گیا ہے۔ناول کے کرداروں کی جڑیں اپنی سرزمین سے اس طرح جڑی ہوئی ہیں کہ وہ چاہتے ہوئے بھی ماضی کی یادوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ شہلا جو کہ نعیم کے چھوٹے بھائی علی کی بیوی ہے وہ نفسیاتی طور پر شخصی ناسٹلجیا کا شکار ہے وہ اپنی پہلی محبت کے لیے یہ الفاظ استعمال کرتی ہے:

"میری زندگی میں محبت بن کر آنے والا پہلا شخص کچھ روز بعد مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ مگر میں ابھی تک اس کی یادوں کے گرداب سے باہر نہیں آئی۔۔۔۔۔پہلے شخص کو ہم کبھی فراموش نہیں کر پاتے۔"(۲۱)

ناول میں ناسٹلجیائی یادوں کے ساتھ جڑا ہجرت کا واقعہ ہے۔ جس نے بے شمار انسانوں کو جلاوطنی کے درد میں مبتلا کیا۔ غریب الوطنی عبداللہ حسین کی ذات سے جڑا ہوا المیہ دکھ ہے۔ جس کو وہ اپنا انتخاب قرار دیتے ہیں۔ اپنے ایک انٹرویو میں عبداللہ حسین بتاتے ہیں:

"جی ہاں میری ہجرتیں میرا انتخاب تھیں اصل میں بات یہ ہے کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ گویا پندرہ سولہ سال کی عمر سے میرے دل میں یہ بات ہے کہ انسان ایک مستقل جلاوطنی کا عذاب سہہ رہا ہے۔ اس جلاوطنی کا جسمانی ہونا لازمی نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔انسان روحانی طور پر بھی بچھڑا ہوا ہے۔ مادی اور ذہنی اعتبار سے بھی وہ اسی کیفیت میں مبتلا ہے۔ وچھوڑے کا یہ دکھ کسی خاص چیز، وطن یا عورت سے یا کسی اور چیز سے جدائی کا، فاصلے اور دوری کا دکھ نہیں یہ اس کے وجود کا حصہ ہے اس کا مقدر ہے"(۲۲)

غریب الوطنی، انسان کا اضطراب، دل میں پلنے والی بے چینی اور خوابوں کا ٹوٹنا یہ سب موضوع عبداللہ حسین کے ہاں دکھائی دیتے ہیں۔ ناول میں جگہ جگہ ماضی میں پناہ لینے کا ذکر ہے۔ اس کے ساتھ ہجرت کرنے والے افراد کے مصائب و صدموں پر تفصیل سے بات کی گئی ہے کہ کس طرح صدیوں سے ایک جگہ رہنے والے ایک دوسرے کے خون کے دشمن بن گئے اور ایک جگہ سے ہجرت کر کے دوسری جگہ آنے والوں کو کس طرح نفسیاتی اتار چڑھاؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈاکٹر خالد اشرف تحریر کرتے ہیں:

"قافلے پر گزرنے والی مختلف ذہنی و نفسیاتی کیفیتوں، راستے میں پیش آنے والی مصیبتوں۔۔۔۔۔کو عبداللہ حسین نے اس قدر مہارت اور نفسیاتی بصیرت سے پیش کیا ہے کہ تمام اردو ادب میں ہجرت کرنے والے قافلوں کی اتنی حقیقی تصویر کہیں اور نہیں ملتی"(۲۳)

جب ہجرت کے فسادات شروع ہوتے ہیں تو اس وقت بہت سے انسانیت سوز واقعات پیش آتے ہیں۔ ہجرت کے اس کربناک سفر میں انسانوں کی خود غرضی، عیاری اور حرص و ہوس کے واقعات نے زمانہ جہالت کی یاد دلا دی۔

"اداس نسلیں" پہلی جنگ عظیم سے لے کر برصغیر کی تقسیم اور ہجرت کی تکالیف کے تناظر میں لکھا گیا ناول ہے۔ ناول میں انگریزوں کا ظلم و ستم کا رویہ، مسلمانوں کی غلامانہ زندگی، آزادی، آزادی کے لیے جدوجہد اور ہجرت کا واقعہ، فسادات میں تباہی و بربادی کا بہترین طریقے سے احاطہ کیا گیا ہے۔

ناول بستی ۱۹۸۰ میں منظر عام پر آیا اس ناول میں ۱۹۴۷ سے پہلے اور بعد کے حالات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد پیش آنے والے مسائل کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔ ناول کے چار کردار ذاکر، سلامت، افضال اور زوار دوستی کے مضبوط

بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔ وہ روز ایک چائے خانے میں اکٹھے ہوتے ہیں جو "شیراز" کہلاتا ہے ایک جگہ اکٹھے ہو کر وہ ملکی حالات پر بات چیت کرتے ہیں۔ چاروں دوست متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے ساتھ ساتھ ذی شعور بھی ہیں اور حساس طبیعت کی وجہ سے ملکی حالات کے اتار چڑھاؤ سے فرسٹریشن کا شکار بھی ہیں۔ انتظار حسین نے اپنی دیگر تحریروں میں ناسٹلجیا کو دبے الفاظ میں بیان کیا تھا۔ مگر ان کا ناول "بستی" دراصل ناسٹلجیا ہی کی پیداوار ہے۔ انتظار حسین نے ہجرت کی اذیت ناک کیفیت کو برداشت کیا ہے۔ اس ناول میں ہجرت کے اثرات اور ناسٹلجیا کا نیا رجحان اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ناول نگار ماضی کے ساتھ ساتھ حال اور مستقبل کو بھی دیکھتا دکھاتا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان تحریر کرتے ہیں:

> "دیگر فنکاروں کے ہاں نسٹالجیا اشارۃً نظر آتا ہے۔۔۔۔۔۔ مگر انتظار حسین کے ہاں ہر کردار گزرے وقت کی یادوں میں کھویا ہوا ہے۔ ان کے کرداروں کے متعلق ایسا محسوس ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ جیسے یہ سب ہندوستان سے پاکستان ہجرت کر کے پچھتا رہے ہوں اور ابھی تک اس سکون کے متلاشی ہوں جس کی خاطر انہوں نے ہجرت کی تھی۔ دراصل ماضی کا شدید احساس ہر اس شخص کی سوچ کا حصہ ہوتا ہے جو ہجرت سے گزرا ہو"(۲۴)

ہجرت کر کے آنے والے افراد ماضی کے شدید احساس کی لپیٹ سے باہر نہیں آپاتے۔ ماضی کی یادیں ذہن سے کبھی جدا نہیں ہو پاتیں۔ کیوں کہ یہ بات انسانی فطرت میں شامل ہے کہ گزرا ہوا وقت یا ماضی کی یادیں انسانی زندگی کے لئے خزانے کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان یادوں کی دنیا میں بار بار جانے کو پناہ لینے کو دل چاہتا ہے۔ ناول میں بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کر کے جانے والوں کے کرب کا ذکر ہے اور ان اذیت ناک جذبوں کو بیان کیا گیا ہے جو ایک ملک، علاقے یا زمین سے ہجرت کر کے دوسرے ملک، علاقے یا زمین میں آنے والوں کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ دراصل ہجرت سے مراد صرف ایک جگہ سے دوسری جگہ پر جانا ہی نہیں ہوتا بلکہ ہجرت تو اپنی ذات، کائنات اور اپنے مرکز سے جدا ہونے کا نام ہے۔ یہاں تک کہ ہجرت ایک وقت سے دوسرے وقت کی طرف منتقلی ہے۔ انتظار حسین کے لیے بھی بستی پوری دنیا اور زمانے میں سب سے زیادہ خوشحال اور پر امن جگہ تھی۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان سے اپنے ایک مکالمے میں انتظار حسین نے اپنی بستی اور اس سے جڑی ہوئی یادوں کو اس طرح بیان کیا ہے:

> "علی گڑھ کے قریب بلند شہر کے ضلع میں ایک چھوٹی سی بستی تھی ڈبائی۔ سنتے ہیں اب بھی ہے اس بستی میں پیدا ہوا۔ جہاں تک میرا خیال ہے میں دس گیارہ سال تک اس بستی میں رہا ہوں۔ وہ تو دس سال تھے یا دس گیارہ سال۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ ایک پوری صدی تھی، وہ علاقہ وہ چھوٹی سی زمین، وہ بستی، اس کے باہر کے چھوٹے چھوٹے دیہات جہاں میں کبھی کبھی یکے پر بیٹھ کر جایا کرتا تھا اور کبھی بیل گاڑی میں۔ ان سب چیزوں کو دھیان میں لاتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ چھوٹی سی زمین پورا برِ اعظم تھی۔"(۲۵)

انتظار حسین کے کرداروں کا نفسیاتی مسئلہ ہی ناسٹلجیا ہے۔ کیوں کہ ہجرت کے ساتھ ناسٹلجیا لازم وملزوم ہے یاد اور یاداشت سے انسانی شخصیت تشکیل پاتی ہے۔ اگر یادیں نہ ہوں تو ماضی کا وجود بھی برقرار نہیں رہ سکتا۔

ناول کا مرکزی کردار ذاکر ہے۔ جو شروع سے آخر تک ناول پر چھایا دکھائی دیتا ہے۔ ناول نگار نے اس کردار کے ذریعے ماضی اور حال، شکست اور تباہی کی فضا قائم کی ہے۔ ذاکر کا گھرانہ بی اماں کی وفات کے بعد پاکستان ہجرت کر کے آتا ہے۔ یہ لوگ مل کر ایک نئی بستی بناتے ہیں۔ مگر تمام مہاجرین پرانی یادوں سے پیچھا نہیں چھڑا پاتے۔ ایک طرف ان کے دل و دماغ پر پرانا گھر اور بستی کی یادیں چھائی ہوئی ہیں تو دوسری طرف انہیں نئی بستی میں پیش آنے والے حالات سے بھی شکوے ہیں۔ ڈاکٹر خالد اشرف تحریر کرتے ہیں:

> "ذاکر اور ذاکر کے والدین۔۔۔۔۔۔۔ان مہاجرین سے تعلق رکھتے ہیں جو جسمانی طور پر پاکستان میں بس تو گئے ہیں لیکن زندگی کا کوئی خاص حصہ گزرے وقت کی دلدل میں پھنس گیا ہے۔" (۲۶)

ذاکر اور اس کا خاندان ہجرت کرنے کے بعد کئی نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے واقعے نے سب کے دلوں کو زخموں سے چور کر دیا تھا۔ ناول کا ایک اور کردار خواجہ صاحب سقوط ڈھاکہ کی وجہ سے اس قدر دکھی حالت میں ہے کہ ریڈیو پر خبریں سنتے ہوئے اونچی آواز میں چلا کر روتا ہے۔ ذاکر، اس کا خاندان اور دیگر بستی والے بھی اس واقعے سے متاثر نظر آتے ہیں "بستی" میں پائے جانے والے تمام افراد کے دکھ مشترکہ ہیں مگر ذاکر اور اس کا خاندان ہجرت کے بعد محرومی، دکھ اور کرب سے اس قدر دوچار ہے کہ وہ اپنی محرومیوں کے مداوے کے لیے پرانی بستی روپ نگر کی یادوں میں پناہ لیتے ہیں کیوں کہ زندگی میں پائے جانے والے غموں اور محرومیوں کے لیے مداوے کی خواہش انسانی فطرت میں شامل ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان تحریر کرتے ہیں:

> "مداوے کی خواہش بھی انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ صبح سے لے کر شام تک تناؤ، افسردگی، گھبراہٹ۔۔۔۔۔۔کو چند لمحوں کے لیے ٹالنے کے لیے یاد کی گود میں سو جانا۔۔۔۔۔۔ماضی کے عطا کردہ سکون اور شادمانی کی بازیافت کا مثبت جذبہ ہے۔"(۲۷)

ناول بستی میں ناسٹلجیا کا عنصر باقی تمام جذبات اور احساسات پر حاوی نظر آتا ہے۔ ناول حقیقت میں یادوں کے کرب پر مشتمل ہے۔ ناول میں موجود انسان، مکان، درخت، کتابیں، ستارے سب کے سب چند لمحوں کے لیے سامنے آتے ہیں اور پھر یادوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ناول میں یاداشت کی اس قدر اہمیت ہے کہ کوئی بھی کردار ناسٹلجیا کے بغیر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ پاتا۔ ناول کے کردار خوشگوار اور ناخوشگوار یادوں کی دھند میں ماضی تلاش کر رہے ہیں۔ ذاکر بھی ناخوشگوار یادوں کے کرب سے دوچار ہے۔ جب ذاکر کی پرانی بستی روپ نگر میں طاعون کی بیماری پھیلی تو اس وبا کی وجہ سے کتنے ہی خاندان موت کے منہ میں چلے گئے تھے۔ ذاکر کا ماموں ان لوگوں کو اپنی طرف بلانے کے لیے بیلی بھی بھیجتا ہے۔ لیکن ذاکر کے ابا جان کسی صورت اپنی بستی کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے اور کہتے ہیں:

"بی اماں حضور رسالت مآب ﷺ نے فرمایا کہ جو موت سے بھاگتے ہیں۔ وہ موت ہی کی طرف بھاگتے ہیں"(۲۸)

مگر ایک طرف بی اماں کی وفات ناگہانی آفت ثابت ہوئی اور دوسری طرف روپ نگر کو چھوڑنا بھی کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ بی اماں کی وفات کے بعد سب پاکستان آجاتے ہیں۔ مگر یہاں آکر اس گھرانے کو وہ سب نہیں ملتا جس کی تلاش میں ہجرت کے مصائب سہہ کر پاکستان آئے تھے۔ ہجرت کے دوران پیش آنے والی مشکلات کو بستی کا ایک کردار اس طرح بیان کرتا ہے:

"میں جب گھر سے چلا تھا تو میرے سارے بال سیاہ تھے۔ اس وقت میری عمر ہی کیا تھی؟ بیس اکیس کے پیٹے میں تھا۔ جب پاکستان پہنچا اور نہانے کے بعد آئینہ دیکھا تو میرے سر کے سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ یہ پاکستان میں میرا پہلا دن تھا۔ گھر سے کالے بالوں اور خاندان والوں کے ساتھ نکلا تھا پاکستان پہنچا تو میرا سر سفید تھا اور میں اکیلا تھا۔"(۲۹)

ایسے کئی خاندان تھے۔ جو آنکھوں میں خوشیوں اور سکون کے خواب سجائے ہجرت کر کے جب پاکستان پہنچے تو انہیں سخت مایوسی ہوئی کیوں کہ یہاں وہی بدامنی اور انتشار تھا۔ جس سے چھٹکارہ پانے کے لیے ان لوگوں نے ہجرت کی تھی۔ شروع شروع میں مہاجرین کا استقبال کھلے دل سے کیا جاتا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ پر Idealism ختم ہوتی گئی اور دلوں سے بھی گنجائش ختم ہوتی گئی کئی لوگ خود غرضی اور لالچ میں آکر انسانیت کے درجے سے نیچے گر گئے ہر کوئی اپنے لیے جائیداد بنانے کے چکر میں پڑ گیا اور مہاجرین پر زمین تنگ ہو گئی۔

شام نگر میں نفسا نفسی کا یہ عالم تھا کہ حکیم بندے علی نے تمام مہاجرین کو جس گھر میں پناہ دی تھی۔ اسے اسی گھر سے بے یارو مددگار نکلنا پڑا منشی مصیب حسین نے بھاگ دوڑ کی اور پورے کا پورا مکان اپنے نام سے الاٹ کرالیا مذکورہ بالا اقتباس سے خود غرضی اور ہوس پرستی کی نفسیات کی عکاسی کی گئی ہے۔ ہجرت کر کے آنے والے مہاجروں کو پاکستان میں داخل ہوتے ہی گرفتار کر لیا جاتا تھا اور وجہ اتنی تھی کہ پرانی روایات اور اقدار کا حامی معاشرہ لالچ اور ہوس کی دلدل میں پھنس چکا تھا۔ اس نفسا نفسی کے دور میں عزت کمانے اور پاؤں مضبوط کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ دوسروں کا لحاظ کیے بغیر لوٹ مار اور ہیرا پھیری سے صرف اپنا مفاد سوچا جائے۔

انتظار حسین کی تحریروں میں ہجرت کے ساتھ ناسٹلجیانہ صرف پوری شدت سے سامنے آتا ہے۔ بلکہ نت نئے روپ کے ساتھ بھی اپنا اثر دکھاتا ہے۔ ناول بستی اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ انتظار حسین نے ہجرت اور ناسٹلجیا کے کرب کو پوری ایمانداری سے قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ بستی ناکام افراد اور ناسٹلجیا کی دنیا میں پناہ لینے والوں کی داستان ہے۔ ناول میں کہیں پر علامتی انداز بھی اختیار کیا گیا ہے تو کہیں ڈائری سے راز و نیاز کی باتیں کر کے کتھارسس کا راستہ اپنایا گیا ہے اور کہیں ذاکر فینٹسی (خیالی دنیا) میں بھی پناہ لیتا ہے ۔ انتظار حسین کے ہاں ہجرت ایک اجتماعی دکھ ہے۔ اس میں بچھڑے ہوئے لوگوں کا بہانے سے ذکر بھی ہے اور کربلا سے لائے ہوئے کفن کو پچیس سال بعد دھوپ میں خشک کرنے کی شدید خواہش بھی ہے باپ دادا کا اچانک یاد آنا اور پھر ان کی قبروں پر جا کر دعا کرنے کی آرزو کرنا سب ناسٹلجیا سے پر یادیں ہیں۔ جو ناول بستی میں جگہ جگہ دکھائی دیتی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ قاضی جاوید: "ناسٹالجیا کے بارے میں چند باتیں" مشمولہ ماہ نو، اکتوبر ۱۹۹۸، ص ۲۱

2. Advanced practical Dictionary (English to English and Urdu) with brief General knowledge Azhar publisher Lahore P # ۸۵۲

۳۔ انتظار حسین: "اردو کا مختصر افسانہ پاکستان میں" مطبوعہ سیپ ۱۲ (خاص نمبر) ص 375

۴۔ خدیجہ مستور، آنگن، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۵

۵۔ ایضاً، ص ۶ ۶۔ ایضاً، ص ۵۲ ۷۔ ایضاً، ص ۶ ۸۔ ایضاً، ص ۵۲ ۹۔ ایضاً، ص ۵۴

۱۰۔ روبینہ الماس، اردو افسانے میں جلاوطنی کا اظہار، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۲۰

۱۱۔ اسلوب احمد انصاری ڈاکٹر، اردو کے پندرہ ناول، یونیورسل بک ہاؤس، ۲۰۰۳ء، ص ۱۶۵، ۱۶۴

۱۲۔ خالد اشرف ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۲

۱۳۔ محمد افضال بٹ ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۰۱ء، ص ۱۸۳، ۱۸۲

۱۴۔ قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۶۰

۱۵۔ ایضاً، ص ۶۹

۱۶۔ ایضاً، ص ۷۴

۱۷۔ قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، ص ۷

۱۸۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۲۷

۱۹۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، ص ۵۲۳

۲۰۔ ایضاً، ص ۵۲۵

۲۱۔ ایضاً ص ۲۱۱

۲۲۔ محمد عاصم بٹ، عبداللہ حسین شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات اسلام آباد پاکستان، ۲۰۱۱ء، ص ۱۳۸ تا ۱۳۹

۲۳۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، ص ۲۰۷

۲۴۔ ممتاز احمد خان ڈاکٹر، اردو ناول کے بدلتے تناظر، تنقید و میکم بک لمیٹڈ، ۱۹۹۳ء، ص ۲۴۲

۲۵۔ انتظار حسین، بستی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۱۳۲۴۔

۲۶۔ برصغیر میں اردو ناول، ص

۲۷ اردو ناول کے بدلتے تناظر، (تنقید)، ص ۲۴۴

۲۸۔ بستی، ص ۸۷

۲۹۔ ایضاً، ص ۸۰، ۷۹

☆☆☆☆☆